علامہ اقبال اور راس مسعود

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

یوں تو علامہ اقبال کے دوستوں اور احباب کا حلقہ خاصا وسیع تھا، لیکن جن لوگوں سے اُنھیں ایک گہرا اور دلی تعلق خاطر تھا، وہ گنے چُنے ہی تھے اور ان میں سر راس مسعود (۱۸۹۴ء - ۱۹۳۷ء) کا نام سرفہرست ہے۔ اقبال نے ان کا نام متعدد خطوں میں جیسی والہانہ محبت اور جس درجہ گرم جوشی کا اظہار کیا ہے، وہ کسی اور معاصر کے لیے نظر نہیں آتی۔ اسی لیے راس مسعود کی وفات پر انھوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار ''مسعود مرحوم'' کے عنوان سے ایک منظوم مرثیے کی صورت میں کیا، اس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رُلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمّاے موت کی ہے کشود

''دلے کہ عاشق و صابر بود، مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است''[۱]

(سعدی)

ایسی کسک، ایسی محرومی اور ایسے دکھ کا اظہار، اس سے پہلے صرف اس رثائی نظم میں نظر آتا ہے جو اقبال نے ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے عنوان سے لکھی تھی۔[۲]

۲

نواب مسعود جنگ بہادر سر راس مسعود (۱۵/فروری ۱۸۸۹ء علی گڑھ - ۳۰/جولائی ۱۹۳۷ء بھوپال) سر سید احمد خاں کے پوتے اور سید محمود کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم (قرآن مجید، گلستان، بوستان، نوشت وخوان، حساب کتاب) گھر پر حاصل کی جس میں ان کی والدہ اور دادا سر سید احمد خاں کا دخل تھا۔

راس مسعود کی رسم بسم اللہ کی روداد بڑی دلچسپ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تقریب علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ۳۰/دسمبر ۱۸۹۳ء کو منعقد ہوئی۔ تقریب کیا تھی ایک طرح کا جشن تھا۔ سب سے پہلے راس مسعود نے بسم اللہ اور پھر کلمۂ طیبہ اپنی زبان سے ادا کیا۔ اس موقعے پر خود سر سید احمد خاں اور ان کے نہایت گہرے اور قریبی دوست راجا جے کشن داس بھی موجود تھے۔ راجا صاحب نے راس مسعود کو ۵۰۰ روپے دیے۔ سر سید نے پوتے سے سوال کیا: ”بیٹے اتنے بہت سے روپوں کا تم کیا کرو گے؟ پونے پانچ برس کے بچے نے روپے دادا کی طرف بڑھاتے ہوئے برجستہ جواب دیا: لیجیے آپ انھیں کالج کے کام میں لگا دیجیے“۔[۳]

راس مسعود پانچ سال کی عمر میں سکول جانے لگے۔ بالعموم وہ اپنے دادا کے پاس ہی رہتے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں سر سید فوت ہو گئے تو راس مسعود کو ان کی جدائی اور ان کی شفقت سے محرومی کا شدید احساس ہونے لگا۔ اس وقت ان کے والد سید محمود لکھنؤ میں مقیم تھے۔ وہ علی گڑھ آ گئے لیکن مشاورت کے بعد، راس مسعود کو علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر موریسن اور ان کی بیگم کی نگرانی میں دے دیا گیا تا کہ وہ اپنے تجربات کی مدد سے راس مسعود کی تعلیم و تربیت کا بہتر انتظام کر سکیں۔ کچھ عرصے بعد موریسن کی کوششوں سے راس مسعود کو انگریزی وظیفے پر مزید تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیج دیا گیا۔

انگلستان کے زمانۂ طالب علمی میں راس مسعود کو برطانوی سوسائٹی کے شرفاء، اُدباء اور دیگر باذوق لوگوں سے میل ملاقات کے وافر مواقع میسر آئے جس سے ان کی ذہنی تربیت کے ساتھ ان کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوا۔[۴]

آکسفورڈ میں انھیں عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر انصاری اور معروف انگریزی ادیب ای ایم فاسٹر کی صحبت میسر رہی۔ اس زمانے میں کبھی کبھی وہ اپنے پرانے ہم جماعتوں ہارون خاں شیروانی اور نواب سعید سے ملنے کے لیے پیرس بھی چلے جاتے تھے۔ پیرس آمد و رفت کا یہ فائدہ ہوا کہ انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھ لی، بلکہ اس میں خوب مہارت پیدا کر لی۔ ۱۹۰۹ء میں آکسفورڈ سے بی اے آنرز اور ۱۹۱۲ء میں لنکنز اِن سے بیرسٹر ایٹ لا کی ڈگری حاصل کر کے واپس آئے اور پٹنہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔[۵] مگر اپنی افتادِ طبع کی بنا پر وہ اس مصروفیت کو زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکے۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ ان کے لیے وکالت کا پیشہ ناموزوں ہے۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے انڈین ایجوکیشنل سروس میں شمولیت اختیار کی اور گورنمنٹ ہائی سکول پٹنہ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے، بعد ازاں گورنمنٹ ماڈل کالج کٹک (اڑیسہ) میں تاریخ کے سینئر پروفیسر

رہے۔ آخر میں ریون شا کالج کٹک (اڑیسہ) کے پرنسپل ہو گئے۔[٦]

سر اکبر حیدری کی تحریک پر ۱۹۱۶ء میں انھیں حیدر آباد دکن میں ڈی پی آئی (تعلیم) مقرر کیا گیا۔ ان کی نظامت میں ریاست حیدر آباد نے تعلیم کے شعبے میں غیر معمولی ترقی کی۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۱۹ء میں جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کا قیام ہے۔ ۱۹۲۲ء میں وہ جاپان گئے۔ تقریباً تین ماہ کے قیام میں وہاں کے تعلیمی نظام کا بغور جائزہ لیا اور ایک تفصیلی رپورٹ بعنوان Japan and its Educational System کے نام سے شائع کی (۱۹۲۵ء میں انھوں نے دوبارہ جاپان کا سفر کیا)۔۔۔ مذکورہ رپورٹ میں بعض ایسی تعلیمی اصلاحات تجویز کی گئی تھیں جو بے حد دور رس نتائج کی حامل تھیں۔ جلیل قدوائی لکھتے ہیں:

> راس مسعود کی اصلاحات سے ''امتحانات اور تعلیم کا معیار بلند ہوا، نصاب بدلے گئے۔ اسلامیات، دینیات، جغرافیہ، اردو اور خصوصیت سے سائنس اور تربیت اساتذہ کے شعبے (جس میں زراعت ایک مضمون کے طور پر شامل ہوا، بلند ترین معیار پر لائے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ یونی ورسٹی کی ڈگریوں کی ہندوستان بھر میں دھوم مچ گئی اور انھیں حکومت اور قومی اداروں نے قابلِ وقعت سمجھا۔''[٧]
>
> طلبہ کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہوا۔ راس مسعود نے بعض نئی سکیمیں بنائیں اور ذاتی اثر و رسوخ اور کاوش سے انھیں سرکار سے منظور کرایا۔ بہت سے نئے کالج کھولے گئے۔۔۔ مختصر یہ کہ محمد حبیب اللہ رشدی کے الفاظ میں: ''ان کا دور سر رشتہ تعلیمات ریاست حیدر آباد کی تاریخ کا درخشاں دور تھا''۔[٨]

ان کی خدمات پر نظام دکن نے انھیں ''نواب مسعود جنگ بہادر'' کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۸ء میں راس مسعود نے یہ ملازمت چھوڑ دی۔ اگلے ہی برس انھیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔

۳

سر راس مسعود اور علامہ اقبال کی اوّلین ملاقات کب ہوئی؟ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

علامہ اقبال اور راس مسعود دونوں ۱۹۰۵ء میں عازمِ انگلستان ہو گئے۔ اقبال ۱۹۰۸ء تک اور راس مسعود ۱۹۱۲ء تک وہاں مقیم رہے۔ ممکن ہے اس زمانے میں کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو، مگر دونوں کی کسی ملاقات یا رابطے کی کوئی شہادت میسر نہیں۔ اقبال نے اپنے قیام انگلستان کا زیادہ تر عرصہ کیمبرج میں گزارا راس مسعود آکسفورڈ میں مقیم رہے اور جب ۱۹۰۹ء میں راس مسعود بار ایٹ لا کے لیے لندن آ کر لنکنز اِن میں داخل ہوئے[٩] تو اقبال چند ماہ قبل (جولائی ۱۹۰۸ء میں) واپس ہندوستان جا چکے تھے۔ قیاس یہ ہے سر راس مسعود اور اقبال کی پہلی ملاقات اور تعلقات کی ابتدا ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد دکن میں ہوئی۔[١٠] ۱۸/ نومبر ۱۹۲۹ء کو

جب علامہ اقبال انگریزی خطبات پیش کرنے کے لیے علی گڑھ پہنچے[۱۱] اور ایک ہفتہ وہاں مقیم رہے تو راس مسعود اور اقبال ایک دوسرے سے مزید قریب آ گئے اور واقفیت باہمی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

علی گڑھ میں اقبال ہر روز ایک خطبہ پیش کرتے۔ ایک ہفتگی قیام میں، وہ متعدد دعوتوں اور ضیافتوں میں بھی شریک ہوئے۔ طلبہ اور اساتذہ سے بھی ملتے رہے۔ انھیں سر راس مسعود کی غیر معمولی صلاحیتوں کا کچھ اندازہ ہوا۔ راس مسعود کو چند ماہ قبل ہی ایسے حالات میں یونی ورسٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا، جب بقول مولوی عبدالحق یونی ورسٹی کی ''بدنامی اور رسوائی دور دور تک پہنچ گئی تھی''۔[۱۲] راس مسعود نے اس کی نظامت سنبھالتے ہی اپنی پہلی تقریر میں کہا:

> میں چاہتا ہوں کہ اس یونی ورسٹی کے نوجوان علم، کھیل، راست بازی اور اخلاق میں اعلیٰ مرتبے کے مالک ہوں اور اس یونی ورسٹی میں کوئی چیز مجھے گوارا نہیں جو دوسرے درجے کی ہو۔[۱۳]

پھر انھوں نے اپنے عزم صمیم، ان تھک محنت اور پُر خلوص کاوشوں سے یونی ورسٹی کی کایا پلٹ دی۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> مسعود سا وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی کو کبھی نصیب ہوا تھا، نہ شاید آیندہ ملے۔ ...... مسعود کے آتے ہی رنگ بدل گیا۔ اس نے اپنی ذاتی وجاہت اور اثر اور کوشش سے بدنامی کا دھبا مٹا دیا کھوئے ہوئے وقار کو قائم کیا، بڑھایا اور اوج تک پہنچا دیا۔ مایوسی کو امید سے بدل دیا۔ طلبہ اور اساتذہ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔[۱۴]

اصلاح احوال کے لیے راس مسعود کی کوششوں سے متاثر ہو کر اقبال نے ۹ رجنوری ۱۹۳۰ء کو، مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھا:

> میں بھی ایک ہفتے کے لیے علی گڑھ گیا تھا۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونی ورسٹی کی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی ہو گی۔[۱۵]

علی گڑھ میں قیام کے دوران میں، علامہ اقبال کو یونی ورسٹی سٹوڈنٹس کی اعزازی لائف ممبر شب بھی دی گئی۔ اقبال اور راس مسعود کو باہمی ملاقاتوں، گفتگوؤں اور تبادلۂ خیالات کا وافر موقع میسر آیا۔ سر راس مسعود ایک طبّاع شخص تھے۔ قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔ طبیعت نکتہ رس پائی تھی۔ اپنی دلچسپ اور شاندار گفتگو سے حاضرین کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اقبال کو راس مسعود کی غیر معمولی شخصیت اور ذہانت کا اندازہ ہوا۔ دوسری طرف راس مسعود کو اقبال کے عبقری ذہن اور کمال فن کو سمجھنے کا موقع ملا۔ پھر اس تعلق نے ایک دلی ارتباط کی شکل اختیار کر لی۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شاہِ افغانستان کی طرف سے دونوں کو دورۂ افغانستان کی دعوت ملی۔ راس مسعود اور اقبال کو اس سفر میں مسلسل بارہ روز تک شب و روز ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، ملنے جلنے اور علمی، سیاسی اور ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔

اسی طرح متعدد دعوتوں، تاریخی مقامات و مقابر کی زیارتوں اور افغانی اکابر و اعیان سے ملاقاتوں میں بھی وہ اکٹھے رہے۔[۱۶] یوں دورۂ افغانستان دونوں کے لیے باہمی قربت و یگانگت کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا۔

۴

جنوری ۱۹۳۴ء میں علامہ اقبال کی طویل علالت کا آغاز ہوا۔ ان کا گلا بیٹھ گیا اور آواز قریب قریب بند ہوگئی۔ طرح طرح کے علاج آزمائے گئے۔[۱۸] اس اثنا میں راس مسعود علی گڑھ سے مستعفی ہو کر ریاست بھوپال سے وابستہ ہو چکے تھے۔ انھیں اقبال کی علالت کا علم ہوا تو انھوں نے علامہ کو بھوپال کی طرف سے، بھوپال آ کر علاج معالجے کی پیش کش کی۔ اقبال نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ یہاں سے راس مسعود اور اقبال کے باہمی مراسم و تعلقات میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

بھوپال میں علاج کے لیے پہلی بار آمد (۳۱ رجنوری ۱۹۳۵ء) کے موقع پر، اقبال کو لینے کے لیے راس مسعود بذات خود ریلوے اسٹیشن پہنچے، پنجاب میل آ کر رُکی اور علامہ افغانی ٹوپی، شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اُترے تو راس مسعود نے بڑے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ آگے بڑھ کر بغل گیر ہوئے اور ان کی پیشانی کے بوسے لیے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ اس منظر پر حیران ہوئے مگر راس مسعود کے محبت بھرے خلوص نے انھیں متاثر بھی کیا۔

مئی ۱۹۳۵ء میں جب اقبال بھوپال میں ماورا بنفشی شعاعوں کے علاج کا پہلا مرحلہ مکمل کر کے واپس لاہور آ چکے تھے۔ ریاست بھوپال کی طرف سے اقبال کے لیے پانچ سو ماہوار وظیفے یا پنشن کا اجرا عمل میں آیا۔ اس زمانے میں اقبال کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ وکالت سے آمدنی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ کتابوں کی رائلٹی سے کچھ رقم مل جاتی، وہی ان کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ ان حالات میں جب وہ اپنے بقول ’’چاروں طرف سے آلام و مصائب میں محصور تھے‘‘[۱۹] مذکورہ وظیفہ، ان کے لیے خاص تقویت کا باعث ہوا۔ یہ سب راس مسعود کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور اقبال کو اس کا بخوبی احساس تھا، مگر ان سے ایک دلی موانست تھی اس لیے انھیں لکھا: ’’آپ کا شکریہ کیا ادا کروں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے‘‘۔[۲۰]

جواباً راس مسعود نے انھیں لکھا: ’’یہ یاد رکھو کہ مجھے تم سے اس قدر گہری قلبی محبت ہے کہ جو کچھ خدمت میں تمہاری کر سکتا ہوں، اس میں کمی کبھی نہ آوے گی‘‘۔[۲۱]

اسی زمانے میں علامہ کی بیگم (والدۂ جاوید اقبال) فوت ہوگئیں۔ اقبال سخت پریشان ہوئے، راس مسعود کو لکھا: ’’دونوں بچے میرے لیے ایک مسئلہ بن گئے ہیں، جس کی سنگینی کو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔‘‘[۲۲]

جواباً راس مسعود نے لکھا: ’’تم سے ملنے کو میرا دل پھڑک رہا ہے۔ خاص کر جب سے تمھیں یہ صدمہ اٹھانا پڑا

> ہے۔ میں اور میری بیوی تمھاری طرف سے بے حد پریشان ہو گئے ہیں۔ خدا ہمیشہ تمھارا محافظ رہے۔ یہ بھی لکھے دیتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں جاوید کی طرف سے تمھیں کوئی خاص فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''[۲۳]

۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں علاج کے سلسلے میں علامہ اقبال تین بار بھوپال گئے اور کئی کئی ہفتے وہاں مقیم رہے۔ اقبال اور راس مسعود کو اس زمانے میں باہمی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے لیے وافر وقت اور مواقع میسر آئے۔ شام کے اوقات میں بسا اوقات راس مسعود، اقبال کی قیام گاہ پر اور کبھی اقبال، راس مسعود کے ہاں چلے جاتے۔ رات نو دس بجے تک دونوں کے درمیان مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی۔[۲۴] دراصل راس مسعود طرح طرح سے اقبال کا دل بہلانے کی کوشش کیا کرتے۔ مقصود یہ تھا کہ اپنی بیماری اور والدۂ جاوید کی تشویش ناک علالت سے ان کی توجہ ہٹی رہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ اختر جمال اپنے والد کے حوالے سے راوی ہیں کہ:

> ایک محفل میں آٹھ بجے سے دس بجے تک اقبال اور سر راس کے درمیان بیت بازی ہوئی۔ سر راس نے یہ شرط رکھی تھی کہ شاعرِ مشرق کے علاوہ اور کسی کے شعر قبول نہیں کیے جائیں گے۔ بیت بازی میں سر راس کی جیت ہوئی اور اقبال نے اعتراف کیا کہ انھیں اپنے اتنے اشعار یاد نہیں، جتنے راس مسعود کو یاد ہیں۔[۲۵]

اس طرح کی بے تکلفی نے انھیں ایک دوسرے سے اور قریب کر دیا۔

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں پانی پت میں مولانا حالی کی صد سالہ جوبلی منائی گئی۔ سر راس مسعود اس میں شرکت کے لیے پانی پت گئے اور (غالبًا انھی کے ایما پر) علامہ اقبال نے بھی بعض احباب کے ہمراہ پانی پت کا سفر اختیار کیا۔ سر راس مسعود اپنی بے تکلفانہ افتادِ طبع کی بنا پر کبھی کبھی علامہ اقبال سے بھی بے تکلفی کیا کرتے تھے۔ پانی پت میں قیام کے دوران میں ایک صبح اس طرح کا واقعہ پیش آیا۔ راس مسعود بیٹھے حجامت بنا رہے تھے۔ شیو کے لیے منہ پر صابن ملا ہوا تھا۔ اقبال قریب ہی نیم دراز تھے۔ دورانِ گفتگو، راس مسعود، علامہ کے کسی شعر پر وجد میں آ گئے تو جُھک کر علامہ اقبال کا منہ چوم لیا۔ اُن کا رخسار بھی صابن کے جھاگ سے لتھڑ گیا اور راس مسعود نے قہقہہ لگایا۔[۲۶]

اقبال نے اپنے قیام بھوپال کے زمانے میں راس مسعود کو بہت قریب سے دیکھا اور انھیں ایک سچا دوست اور نہایت مخلص خیر خواہ پایا۔ دورۂ افغانستان میں انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ملک و ملت کی خیر خواہی میں وہ اپنے دادا کے اخلاص اور دردمندی کی روایت کے امین تھے۔ اس طرح ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے دونوں کی دلچسپیاں مشترک تھیں۔ راس مسعود کے اسی اخلاص اور بے لوث محبت کی بنا پر اقبال نے ایک خط میں انھیں لکھا: ''میں آپ کو اپنا دوسرا self خیال کرتا ہوں''۔[۲۷]

بچوں کی پرورش اور حفاظت کے مسئلے پر اقبال نے ۷/جون ۱۹۳۷ء کے خط میں راس مسعود کو لکھا:

''میں اپنے حقیقی عزیزوں سے زیادہ تم پر بھروسا رکھتا ہوں''۔[۲۸]

راس مسعود پر اس اعتماد کا نتیجہ تھا کہ اقبال نے اپنے وصیت نامے میں ترمیم کرتے ہوئے، اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی جگہ راس مسعود کو بچوں کا سرپرست (guardian) تجویز کیا۔[۲۹] راس مسعود کا خیال تھا کہ گارڈین لاہور میں یا لاہور سے قریب تر ہو تو بہتر ہوگا تاہم وہ بچوں کی ۲۲ سال کی عمر تک ان کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوں گے بشرطیکہ وہ خود زندہ رہے۔ ۱۴/جون ۱۹۳۷ء کے خط میں انھوں نے اقبال کو ''نہایت پیارے اقبال'' کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔۔۔ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ تمھارے ان دونوں بچوں کے لیے، ان کی تعلیم کے مسئلے میں، وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے......[۳۰]

مختصر یہ کہ بقول جلیل قدوائی: ''اپنی زندگی کے آخری ایّام میں دونوں ایک دوسرے سے قریب ترین یعنی یک جان دو قالب ہو گئے تھے''۔[۳۱]

مارچ ۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود کے ہاں بچی پیدا ہوئی عام مسلم گھرانوں میں لڑکی کی ولادت پر ایک تاسف یا سرد مہری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مگر علامہ اقبال نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بموجب، اسے اللہ تعالیٰ کی عنایات کا حصہ سمجھتے ہوئے مسرت و شادمانی کا اظہار کیا۔ انھوں نے بچی کا نام نادرہ رکھا اور ایک تاریخی قطعہ بھی قلم بند کیا، اس کے دو شعر ہیں:

یادگارِ سیّدِ والا گہر
نورِ چشمِ سیّدِ محمود ہے
خاندان میں ایک لڑکی کا وجود
باعثِ برکاتِ لا محدود ہے[۳۲]

۵

جولائی ۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود علیل ہو گئے۔ اقبال کو اطلاع ملی تو سخت پریشان ہوئے۔ ممنون حسن خاں کو لکھتے ہیں:

> میں بہت متردد ہوں، بارہ دن کا ملیریا اور اس پر مسلسل سر درد مجھے اندیشہ ہے کہ مسعود بہت کمزور ہو گئے ہوں گے۔ خدا تعالیٰ ان کو جلد صحت کامل عطا فرمائے۔ میرا یہ خط وصول کرتے ہی آپ ان کی خیر خیریت سے آگاہ کریں تا کہ تردد رفع ہو۔[۳۳]

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۳۰/جولائی کو وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے، اقبال نے لیڈی مسعود کے

نام تعزیتی خط میں جو کچھ لکھا، اس سے راس مسعود کے ساتھ ان کے قلبی تعلق کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خط ایک طرح سے راس مسعود کو اقبال کا خراجِ تحسین بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

> میں آپ کو صبر و شکر کی تلقین کیوں کر کروں، جب کہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے۔ مرحوم سے جو میرے تعلقات تھے، ان کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ اس بنا پر میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں، آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ غالباً مرحوم کے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کے دل پر مرحوم نے اپنی دل نوازی، بلند نظری اور سیر چشمی کا گہرا تعلق نہ چھوڑا ہو۔
>
> مسعود مرحوم اپنے باپ دادا کے تمام اوصاف کا جامع تھا اس نے قدرت سے دادا کا دل اور باپ کا دماغ پایا تھا؛ اور جب تک جیا، اس دل و دماغ سے ملک و ملت کی خدمت کرتا رہا۔ خدا تعالیٰ اسے غریقِ رحمت کرے۔[۳۴]

اس زمانے میں اقبال افسردگی اور رنج والم کی ایک مسلسل کیفیت سے دوچار رہے۔ ممنون حسن کے نام ایک خط میں لکھا: ''مسعود کا غم باقی رہے گا، جب تک میں باقی ہوں''۔[۳۵] دو ماہ بعد انھیں لکھتے ہیں: ''مسعود نہیں بھولتا''۔[۳۶] درحقیقت راس مسعود نے جس خلوص اور والہانہ پن سے اقبال کی رفاقت و اعانت کی اور ان کی خیر خواہی کے لیے کوشاں رہے[۳۷] اس کے پیش نظر اقبال کا اس قدر رنجیدہ ہونا فطری تھا۔

راس مسعود کا انتقال، ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی کا ایک الم ناک سانحہ تھا۔ ای ایم فوسٹر نے غلط نہیں کہا تھا:

> There never was anyone like him and there never will be anyone like him. [38]

راس مسعود کے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے اقبال کو ان سے جس درجہ محبت تھی، اور ان کی جوانی کی موت سے اقبال کو جس درجہ صدمہ ہوا، اس کا ایک اظہار اس مرثیے سے بھی ہوتا ہے، جو ''مسعود مرحوم'' کے عنوان سے ارمغان حجاز میں شامل ہے: اس مرثیے میں (جس کے چند اشعار اس مضمون کی ابتدا میں نقل کیے جا چکے ہیں) اقبال نے حیات و ممات، خودی اور عشق کے موضوعات پر فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال کا اظہار رنج و غم صرف مرثیہ گوئی تک محدود نہ تھا، وہ راس مسعود کے پس ماندگان سے مسلسل رابطہ میں رہے، حتی الوسع ان کی خیر خواہی کرتے رہے۔ راس مسعود کے بیٹے انور امپیریل پولیس سروس میں جانے کے خواہش مند تھے، ان کی کامیابی کے لیے، اقبال کوشش و تدبیر میں لگے رہے۔[۳۹]

علامہ اقبال نے اپنے کتبۂ مزار کے لیے حسب ذیل فارسی رباعی کہہ رکھی تھی۔ راس مسعود کی وفات پر وہ رباعی ممنون حسن کو کتبۂ مزار کے لیے لکھ بھیجی:

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بندِ این و آں آزادہ رفتم
چو بادِ صبح گردیدم دمِ چند
گلاں را رنگ و آبے دادہ رفتم

اور ساتھ ہی انھیں لکھا: ''رباعی کا مضمون مجھ سے زیادہ ان کی زندگی اور موت پر صادق آتا ہے''۔[۴۰]

علامہ اقبال سے تعلق خاطر کے سلسلے میں راس مسعود کے دو اقدامات ایسے ہیں جنھیں ان کے کارناموں میں شمار کرنا چاہیے:

اوّل: بھوپال میں اقبال کے برقی علاج کا اہتمام وانصرام

دوم: بھوپال سے اقبال کے لیے ماہانہ وظیفے کا اجرا

اس ضمن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> زندگی کے آخری عہد میں مرحوم کا توسُّل دربار بھوپال سے ہوگیا تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر سید راس مسعود مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جن دقتوں کا سامنا تھا، اب اُن سے نجات ہوگئی تھی۔ دور آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک اُن کارناموں میں سے ہے جن کو آیندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کرسکیں گی۔ اگر افراد کے مانند اداروں کی بھی کوئی معاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلے میں بھوپال کی نجاتِ اُخروی متیقّن ہے۔[۴۱]

ہمارے خیال میں علامہ اقبال کے دوست، احباب اور معاصرین میں دوسرا کوئی شخص نہیں ملتا، جس کے ساتھ ان کی دوستی اور قربت اس درجہ تعلقِ خاطر میں بدل گئی کہ اقبال اسے دوسرا self خیال کرنے لگے ہوں۔

* * *

حواشی وحوالہ جات

۱- علامہ محمد اقبال، ارمغان حجاز (کلیات اقبال، اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ۲۴۔
۲- بانگ درا (کلیات اقبال، اردو) ص ۲۲۶۔
۳- نور الحسن نقوی، ناموران علی گڑھ، دوم، علی گڑھ یونی ورسٹی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۹۵۔
۴- ایضاً، ص ۲۹۶۔
۵- جلیل قدوائی (مرتب)، شعلۂ مستعجل، راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰۔
۶- ایضاً، ص ۱۷۲۔
۷- ایضاً، ص ۲۹۔
۸- ایضاً، ص ۳۱۔
۹- ایضاً، ص ۱۳۔
۱۰- فقیر سید وحید الدین، روزگارِ فقیر، دوم، لائن آرٹ پریس، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۵۱؛ صہبا لکھنوی، اقبال اور

بھوپال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۹۰۔

۱۱- اصغر عباس، سر سید، اقبال اور علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص۴۱۔

۱۲- عبدالقوی دسنوی، چند ہم عصر، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص۱۹۶۔

۱۳- جلیل قدوائی (مرتب)، مرقّعِ مسعود، راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص۱۹۔

۱۴- ایضاً، ص۱۹۶-۱۹۵۔

۱۵- شیخ عطاء اللہ (مرتب)، اقبال نامہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۲۱۶۔

۱۶- تفصیل کے لیے دیکھیے: علامہ سید سلیمان ندوی، سیر افغانستان، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

۱۷- تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر سید تقی عابدی، چو مرگ آید، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

۱۸- اختر جمال، فنون، مئی جون ۱۹۷۰ء؛ عبدالقوی ءدسنوی، اقبال بھوپال میں، علوی پریس بھوپال، ۱۹۲۷ء، ص۱۱۔

۱۹- ڈاکٹر اخلاق اثر (مرتب)، اقبال نامے، مدھیہ پردیش اقبال اکادمی، بھوپال، ۲۰۰۶ء، ص۱۷۷۔

۲۰- ایضاً، ص۱۷۸۔

۲۱- ایضاً، ص۸۰۔

۲۲- ایضاً، ص۱۷۴۔

۲۳- ایضاً، ص۱۸۲-۱۸۱۔

۲۴- اقبال اور بھوپال، ص۲۰۸ء۔

۲۵- فنون، مئی جون، ۱۹۷۰ء۔

۲۶- مرقّع مسعود، ص۱۴۶؛ شعلۂ مستعجل، ص۶۰۔

۲۷- اقبال نامے، ص۱۹۸۔

۲۸- ایضاً، ص۲۱۲۔

۲۹- ایضاً، ص۲۱۹-۲۱۸۔

۳۰- ایضاً، ص۲۲۳۔

۳۱- شعلۂ مستعجل، ص۵۱۔

۳۲- روزگار فقیر، اوّل، ص۱۶۴۔

۳۳- اقبال نامہ، ص۲۴۷۔

۳۴- ایضاً، ص۲۹۳-۲۹۲۔

۳۵- ایضاً، ص۲۵۰۔

۳۶- ایضاً، ص۲۵۳۔

۳۷- اقبال اور بھوپال، ص۲۴۲۔

۳۸- بحوالہ شعلۂ مستعجل، ص۴۵۔

۳۹- اقبال اور بھوپال، ص۲۹۵-۲۹۴۔

۴۰- اقبال نامہ، ص۲۵۰۔

۴۱- رشید احمد صدیقی، اقبال: شخصیت اور شاعری، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۱۷-۱۶۔

* * *